Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

ڈاکٹر محمد آصف رضا

لیکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق ایجرٹن گریجویٹ کالج، بہاول پور

ناول سفید قلعہ میں مشرق و مغرب کے تہذیبی تعلق کا بیانیہ اور اورحان پاموک کا فکری زاویہ

The Narrative of Cultural Relationship Between East and West in the Novel the White Castle and Orhan Pamuk's Intellectual Perspective

Abstract

Orhan Pamuk's *The White Castle* presents a complex exploration of the cultural relationship between East and West. Set in the seventeenth-century Ottoman Empire, the novel narrates the story of an Italian captive and a Turkish scholar, Hoja, whose intellectual and psychological relationship gradually becomes a symbolic encounter between two civilizations. The Italian captive represents Western rationality, scientific knowledge, and individual consciousness, while Hoja reflects the Eastern world, shaped by tradition, authority, and a desire to acquire Western knowledge. This article examines the novel as a narrative of cultural dialogue, identity crisis, knowledge, and power. Through the physical resemblance, intellectual exchange, and eventual exchange of identities between the two characters, Pamuk challenges the rigid division between East and West. The novel suggests that cultural identities are not fixed or pure; rather, they are fluid, unstable, and formed through contact, imitation, resistance, and mutual influence.

Keywords: Orhan Pamuk, The White Castle, East and West, cultural dialogue, identity crisis.

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

ترک ادبی روایت صدیوں تک شاعری، رزمیہ بیانیے اور کلاسیکی نثری اصناف کے زیرِ اثر رہی تھی؛ اس لیے ناول جیسی جدید بیانیہ صنف ترک ادب کے لیے ایک نئے ادبی اور فکری تجربے کی حیثیت رکھتی تھی۔ چونکہ ناول بنیادی طور پر یورپی ادبی روایت سے آیا تھا، اس لیے ترک ادیبوں کے سامنے ابتدا ہی سے یہ سوال موجود رہا کہ اس مغربی صنف کو مقامی تہذیبی، اخلاقی اور سماجی اقدار کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ترک ناول اپنے آغاز ہی سے محض ادبی تجربہ نہیں رہا بلکہ تہذیبی شناخت، مغربیت، جدیدیت اور مقامی روایت کے درمیان جاری کشمکش کا مظہر بن گیا۔ جمہوریہ ترکی کے قیام (1923ء) کے بعد ناول کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ اس عہد میں ناول محض تفریحی یا جمالیاتی صنف نہیں رہا بلکہ قومی شناخت کی تشکیل، سماجی اصلاحات، ریاستی نظریات، جدیدیت کے اثرات اور تہذیبی تبدیلیوں کو بیان کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ بن گیا۔ ترک ناول نگاروں نے اس صنف کے ذریعے نئے ترک معاشرے کے فکری، سیاسی اور تہذیبی سوالات کو موضوع بنایا۔ اس طرح ترک ناول جدید ترکی کی اجتماعی نفسیات، تاریخی شعور اور شناختی بحران کا ترجمان بن کر سامنے آیا۔

ترک محقق جالے پارلا (Jale Parla, 1945–2022) کے مطابق 1870ء کی دہائی سے لے کر آج تک ترک ناول میں چند موضوعات مستقل طور پر دہرائے جاتے رہے ہیں، جن میں گھر، باپ، تاریخ، یادداشت، شناخت، تحریر اور ادیب کا کردار خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ موضوعات صرف ادبی نہیں بلکہ گہرے تہذیبی اور قومی معنی بھی رکھتے ہیں۔ جمہوریہ کے قیام کے بعد بھی ترک ادیبوں نے انہی موضوعات کے ذریعے فرد اور قوم کے باہمی تعلق، ماضی اور حال کی کشمکش، مغربیت اور مقامی شناخت، نیز روایت اور جدیدیت کے تصادم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے ترک ناول کو محض ادبی صنف نہیں بلکہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ نویسی کا ایک اہم وسیلہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔[1]

تاریخِ انسانی میں مشرق اور مغرب کے درمیان تہذیبی کشمکش ایک مستقل اور ہمہ گیر موضوع رہی ہے۔ یہ کشمکش محض سیاسی یا عسکری تصادم تک محدود نہیں بلکہ فکری، ثقافتی، علمی اور نفسیاتی سطحوں پر بھی جاری رہی ہے۔ دراصل یہ دو مختلف فکری نظاموں، علمی روایتوں اور دنیا کو دیکھنے کے جداگانہ زاویوں کے درمیان ایک مسلسل تناؤ کا نام ہے۔ مشرق کو عموماً روایت، روحانیت، اجتماعی شعور اور تاریخی تسلسل سے وابستہ کیا جاتا ہے، جب کہ مغرب علم، فردیت، عقلیت، تجربیت اور جدیدیت کو اپنی شناخت کا مرکز بناتا ہے۔ یہی تناؤ جدید دنیا کے فکری مباحث کا بنیادی حوالہ بن جاتا ہے اور اس سے کئی اہم سوالات جنم لیتے ہیں: کیا مغربیت ہی ترقی کا واحد پیمانہ ہے؟ کیا مشرق محض ماضی کی گم شدہ عظمت کا نوحہ ہے؟ کیا مشرق اور مغرب ایک دوسرے کی ضد ہیں یا ایک دوسرے کے عکس؟ اور کیا ان دونوں کے درمیان تصادم کے بجائے مکالمے، مفاہمت اور باہمی اثر پذیری کا امکان بھی موجود ہے؟

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

جغرافیائی اور تاریخی محلِ وقوع کے اعتبار سے ترکی ایک ایسی ریاست ہے جو ایک طرف یورپ کی دہلیز پر واقع ہے اور دوسری طرف ایشیا اور اسلامی دنیا سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ بوسفورس کے دونوں کنارے دو براعظموں کو ملاتے ہیں اور اسی ملاپ کی جگہ استنبول بستا ہے، جہاں باز نطینی گرجے اور عثمانی مساجد آج بھی ایک ہی افق پر موجود ہیں۔ صدیوں کی اسلامی تہذیب اور عثمانی سلطنت کی وارث ہونے کے باوجود ترکی نے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک گہرے سیاسی و تہذیبی انقطاع کا تجربہ کیا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے چند ہی برسوں میں خلافت کا خاتمہ کر کے ایک سیکولر جمہوریہ قائم کی، عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی حروف نافذ کیے، مذہب اور اس کے اداروں کے اختیارات کو محدود کیا اور مغربی قانون، لباس اور معاشرتی اقدار کو ریاستی پالیسی کا حصہ بنایا۔ یہ اقدامات ایک طرف جدیدیت کی طرف پیش قدمی تھے، تو دوسری طرف ایک تہذیبی روایت سے فاصلے کا اظہار بھی، جس کے اثرات آج تک ترک معاشرے کی ذہنی ساخت میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

ترک ناول نگاروں میں ایک اہم نام اور حان پاموک کا ہے۔ اور حان پاموک 1952ء میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی، تعلیم اور تخلیقی شعور اسی شہر کے تہذیبی دوہرے پن میں تشکیل پاتے ہیں۔ استنبول، جو بیک وقت یورپ اور ایشیا پر پھیلا ہوا ہے اور جہاں باز نطینی، عثمانی اور جدید ترک تہذیب کی پرتیں ایک ساتھ موجود ہیں، پاموک کے ادبی تخیل کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ پاموک نے اپنی سوانحی کتاب Istanbul: Memories and the City میں اس شہر پر طاری حزن کا ذکر کیا ہے،[2] ایک ایسی اجتماعی اداسی اور گم شدہ عظمت کا احساس جو استنبول کی تہذیبی یادداشت کا حصہ ہے۔ یہی حزن دراصل مشرق و مغرب کی کشمکش کی جذباتی اور نفسیاتی جہت بھی ہے، جو پاموک کے ناولوں میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ پاموک کے اسی فکری و تخلیقی امتیاز کو عالمی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا۔ 2006ء میں نوبیل انعام دیتے وقت سویڈش اکیڈمی نے ان کے بارے میں کہا:

> "Who in the quest for the melancholic soul of his native city has discovered new symbols for the clash and interlacing of cultures."[3]

اور حان پاموک نے مشرق و مغرب کے تہذیبی تناؤ اور باہمی تعامل کو اپنے ادبی کینوس کا ایک مستقل محور بنایا۔ ان کے ہاں مشرق و مغرب کا یہ تہذیبی تعلق، محض پس منظر یا موضوع کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسی فکری بنیاد بن جاتا ہے جو ان کے فکشن میں بیانیے، کرداروں اور علامتی نظام کو تشکیل دیتی ہے۔ پاموک کے فکشن میں یہ تہذیبی کشمکش کبھی تاریخی سطح پر ظاہر ہوتی ہے، کبھی سیاسی اور سماجی تناظر میں، اور کبھی فرد کی داخلی شناخت، یادداشت اور نفسیاتی بحران کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار اکثر دو تہذیبی دنیاؤں کے درمیان معلق دکھائی دیتے ہیں؛ وہ نہ مکمل طور پر مشرقی روایت میں آسودگی پاتے ہیں اور نہ مغربی

گوہر تحقیق
شعبہ اردو
گورنمنٹ صادق کالج ویمن
یونیورسٹی بہاولپور

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

جدیدیت میں اپنی مکمل شناخت تلاش کر پاتے ہیں۔ اگرچہ یہ موضوع ان کے دیگر اہم ناولوں، مثلاً جہاں برف رہتی ہے اور سرخ میرا نام میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے، تاہم اس فکری بیانیے کا باقاعدہ آغاز سفید قلعہ سے ہوتا ہے، جہاں مشرق و مغرب کا تناؤ علامتی، نفسیاتی اور شناختی سطح پر نہایت باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔

سفید قلعہ کا زمانہ سترہویں صدی کی عثمانی سلطنت ہے۔ یہ وہ دور ہے جب عثمانی دنیا سیاسی اور عسکری اعتبار سے ابھی طاقت ور ہے، لیکن مغرب میں سائنس، طب، فلکیات، انجینئرنگ اور جنگی ٹیکنالوجی کے میدان میں تیز رفتار تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ یورپ نشاۃ الثانیہ اور سائنسی انقلاب کے اثرات سے گزر چکا ہے، جب کہ مشرقی سلطنتیں اپنی روایتی علمی اور سیاسی ساخت کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اسی تاریخی مرحلے میں مشرق اور مغرب کا تعلق محض جنگ یا تجارت تک محدود نہیں رہتا بلکہ علم، ٹیکنالوجی، فوجی طاقت، تہذیبی برتری اور شناخت کے سوالات سے بھی وابستہ ہو جاتا ہے۔ پاموک نے ناول کی کہانی کو اسی تاریخی فضا میں تشکیل دے کر اس تہذیبی تعلق کو نمایاں کیا ہے۔

ناول کا پلاٹ قاری کو سترہویں صدی کے اس تاریخی دور میں لے جاتا ہے، جہاں کہانی کا مرکزی کردار، ایک اطالوی نوجوان، وینس سے نیپلز کی جانب بحری سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ سفر کے دوران اس کا جہاز ترک بحریہ کے قبضے میں آ جاتا ہے اور وہ قید کر لیا جاتا ہے۔ جان بخشی کی امید میں وہ اپنے آپ کو طبیب ظاہر کرتا ہے اور جب وہ ایک اعلیٰ عثمانی افسر پاشا کا کامیاب علاج کرتا ہے تو اسے چند مراعات ملتی ہیں۔ تاہم قانونی و سماجی سطح پر وہ بدستور ایک غلام ہی رہتا ہے۔ اسی دوران، قیدی کی ملاقات خوجہ (Hoja) نامی ایک ترک عالم اور استاد سے ہوتی ہے، جو حیرت انگیز طور پر اس کا ہم شکل نکلتا ہے۔ جو ناول کے مرکزی استعارات میں سے ایک ہے۔ یہی مشابہت ایک فکری اور نفسیاتی اشتراک کا دروازہ کھولتی ہے، جہاں دونوں کردار آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی سوچ، حرکات اور علم میں ضم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اورحان پاموک کا ناول سفید قلعہ بظاہر ایک اطالوی قیدی اور ترک عالم خوجہ کے تعلق کی داستان ہے، لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، یہ تعلق دو افراد کی سطح سے بلند ہو کر مشرق اور مغرب کی دو تہذیبوں کے باہمی ربط، مکالمے، رقابت اور کشمکش کی علامت بن جاتا ہے۔ پاموک اس تہذیبی تناؤ کو محض سیاسی، عسکری یا جغرافیائی سطح پر پیش نہیں کرتے بلکہ اسے انسانی شعور، نفسیات، علم اور شناخت کی تہوں میں اتر کر بیان کرتے ہیں۔ خوجہ اور قیدی کی شخصیات، علمی دلچسپیاں، ذہنی رویے اور باہمی کشش و رقابت دراصل دو مختلف تہذیبی نظاموں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ تاہم پاموک انھیں ایک دوسرے سے قطعی طور پر جدا نہیں دکھاتے؛ بلکہ ان کے ذریعے یہ واضح کرتے ہیں کہ مشرق اور مغرب میں فرق کے باوجود ایک گہرا تہذیبی تعلق اور باہمی اثر پذیری بھی موجود ہے۔

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

اطالوی قیدی، جو وینس کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے، مغرب کی سائنسی روایت، منطقی طرزِ فکر، مشاہداتی علم، انفرادی شعور اور استدلالی ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی تربیت ایک ایسے علمی ماحول میں ہوئی ہے جہاں عقل، تجربہ، مشاہدہ اور شواہد پر مبنی علم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ فلکیات، طب، انجینئرنگ اور فلسفے جیسے علوم سے واقف ہے؛ اس لیے ناول میں اس کا کردار ایک ایسے مغربی انسان کی تصویر بن کر سامنے آتا ہے جو علم کو دنیا کی تفہیم اور تسخیر کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ خوجہ اسی علمی سرمایہ کو ایک مکمل نظامِ فکر کے طور پر دیکھتا ہے اور اس میں اتنی کشش محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنی شخصی ترقی، ریاستی طاقت اور تہذیبی برتری کا وسیلہ بنانا چاہتا ہے۔ قیدی بیان کرتا ہے:

> ''خوجہ نے کہا کہ اسے سب کچھ سکھاؤں۔۔ سب کچھ کا مطلب تھا ہر چیز جو میں نے ابتدائی اور ثانوی سکول میں سیکھی تھی۔ ساری فلکیات، طب، انجینئری، ہر وہ علم جس کی تعلیم میرے ملک میں دی جاتی تھی۔''[4]

یہ اقتباس خوجہ کی علمی طلب اور مغربی علوم کے لیے اس کی غیر معمولی کشش کو واضح کرتا ہے۔ خوجہ کی یہ جستجو محض ایک فرد کی علمی دلچسپی نہیں بلکہ مشرقی دنیا کی اس اجتماعی خواہش کا علامتی اظہار ہے جس کے تحت وہ مغرب کی سائنسی ترقی سے متاثر ہو کر خود کو اسی سطح تک پہنچانا چاہتی ہے۔ تاہم خوجہ کے لیے علم صرف فکری بالیدگی یا ذہنی وسعت کا ذریعہ نہیں؛ وہ اسے طاقت، ریاستی وقار اور تہذیبی غلبے کے ہتھیار کے طور پر بھی دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی علمی طلب کے پس منظر میں ایک گہرا تہذیبی اضطراب بھی موجود ہے۔

خوجہ کا کردار عثمانی سلطنت اور وسیع تر مشرقی دنیا کے اس فکری مزاج کی نمائندگی کرتا ہے جو ایک طرف مذہب، روایت اور سماجی نظم سے وابستہ ہے، اور دوسری طرف مغربی علوم، سائنسی فکر اور تکنیکی ترقی سے شدید متاثر بھی ہے۔ خوجہ مغربی علم کو اپنانا چاہتا ہے، مگر اس عمل میں اپنی تہذیبی برتری کا احساس بھی ترک نہیں کرتا۔ اس کا مقصد محض علم حاصل کرنا نہیں بلکہ اس علم کے ذریعے مغرب کے مقابل کھڑا ہونا اور عثمانی اقتدار کو نئی قوت عطا کرنا ہے۔ وہ قیدی سے سیکھتا ہے، اس کی کتابیں پڑھتا ہے، اس کی زبان سمجھتا ہے اور رفتہ رفتہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں قیدی کی علمی برتری باقی نہیں رہتی۔ قیدی خود اس تبدیلی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''تندہی اور حاضر دماغی کے سبب چھ ماہ کے اندر اندر اس نے اطالوی زبان کی بنیادی فہم حاصل کر لی تھی، میری ساری کتابیں چاٹ گیا تھا، میری اس پر برتری کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔''[5]

گوہرِ تحقیق
شعبہ اردو
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاولپور

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

یہ اقتباس خوجہ کی ذہانت، محنت اور حصولِ علم میں سنجیدگی کو نمایاں کرتا ہے۔ ساتھ ہی یہ اس تہذیبی رشتے کی پیچیدگی کو بھی ظاہر کرتا ہے جس میں مغرب ابتدا میں خود کو علم کا مرکز سمجھتا ہے، مگر مشرق اسی علم کو حاصل کر کے اس برتری کو چیلنج کرنے لگتا ہے۔ قیدی کی برتری کا زائل ہونا اس بات کی علامت ہے کہ علم کسی ایک تہذیب کی مستقل ملکیت نہیں رہتا؛ جو تہذیب اسے جذب کرنے، برتنے اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ طاقت کے نئے امکانات پیدا کر سکتی ہے۔ تاہم پاموک یہ بھی دکھاتے ہیں کہ جب علم کو محض طاقت، غلبے اور برتری کے حصول کا ذریعہ بنا دیا جائے تو وہ فکری آزادی کے بجائے تہذیبی اضطراب اور نفسیاتی رقابت کو جنم دیتا ہے۔

صرف خوجہ ہی ایسا کردار نہیں جو علم و مہارت کے ذریعے برتری حاصل کرنا چاہتا ہے، بلکہ اطالوی قیدی بھی اسی جذبے سے سرشار ہے۔ وہ بھی خوجہ پر ذہنی اور نفسیاتی غلبہ قائم کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے اس کی کمزوریوں، داخلی اضطراب اور شناختی الجھنوں کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سطح پر قیدی کا رویہ مغربی استقلائی شعور کی اس تاریخی روش کی یاد دلاتا ہے جس میں مشرق کو علمی، تہذیبی اور نفسیاتی اعتبار سے کم تر ثابت کر کے اس پر ذہنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ قیدی خوجہ کو شکست دینے کے لیے اسے خارجی طور پر نہیں بلکہ داخلی طور پر کمزور کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

> ''میں انتقام لینا چاہتا تھا، حملہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر خوجہ کو اس کی ذات کے بارے میں کچھ اور شک میں مبتلا کر دوں، اگر اس کے نوشتہ اعترافات میں سے چند ہی پڑھ لوں جنھیں وہ مجھ سے بڑی احتیاط سے چھپاتا ہے اور لطیف انداز میں اسے خفیف کروں تو گھر کا غلام اور عاصی وہ ہو گا، میں نہیں۔''[6]

یہ اقتباس قیدی کی نفسیاتی حکمتِ عملی کو پوری وضاحت کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ وہ خوجہ پر براہِ راست علمی حملہ نہیں کرتا بلکہ اسے اپنی ذات کے بارے میں مشکوک بنانا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل کامیابی یہ ہے کہ خوجہ اپنی داخلی مرکزیت کھو دے اور خود کو قیدی سے کم تر محسوس کرنے لگے۔ اسی لیے قیدی ایک اور مقام پر کہتا ہے: جب خوجہ نے اپنی خفت کروالی ہو گی، میں اس سے اپنی برتری قبول کرواؤں گا۔ یہاں برتری صرف علم، عقل یا مہارت کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتی بلکہ ایک قسم کی نفسیاتی تسخیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ قیدی خوجہ کو اس کی ذات، ماضی اور اعترافات کے ذریعے زیر کرنا چاہتا ہے۔ اس اعتبار سے ناول میں علم محض آگہی کا وسیلہ نہیں رہتا بلکہ طاقت، غلبے اور شناختی شکست کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پاموک اس تعلق کے ذریعے یہ واضح کرتے ہیں کہ مشرق و مغرب کا

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

رشتہ صرف علمی تبادلے یا تہذیبی مکالمے کا رشتہ نہیں بلکہ اس میں حسد، خوف، تسخیر، برتری اور احساسِ کم تری جیسے نفسیاتی عناصر بھی شامل ہیں۔

اورحان پاموک کے ناول سفید قلعہ میں خوجہ اور اطالوی قیدی کے درمیان جسمانی مشابہت محض ایک اتفاق یا افسانوی واقعہ نہیں، بلکہ پوری کہانی کی فکری اساس بن جاتی ہے۔ یہی مشابہت ناول میں شناخت، تہذیبی مماثلت اور خودی کے بحران جیسے مرکزی موضوعات کو جنم دیتی ہے۔ ناول کے ابتدائی حصے ہی میں راوی اس حیرت کا اظہار کرتا ہے جو خوجہ کو دیکھ کر اسے محسوس ہوتی ہے:

"اور کمرے میں داخل ہونے والے شخص میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔۔۔ یہ میں ہوں۔"[7]

یہ جملہ ناول کی بنیادی فکر کو نہایت اختصار مگر گہرائی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔ قیدی خوجہ کو صرف اپنے جیسا نہیں پاتا بلکہ اسے اپنا عکس محسوس کرتا ہے۔ یہ مشابہت صرف جسمانی سطح تک محدود نہیں رہتی بلکہ دونوں کردار ذہنی، فکری اور علمی سطح پر بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں۔ خوجہ اور قیدی دونوں ذہین، متجسس اور علم کے خواہش مند ہیں۔ دونوں سائنس، فلکیات، طب اور دیگر عقلی علوم میں دلچسپی رکھتے ہیں اور دونوں علم کو محض فہم و آگہی کے لیے نہیں بلکہ طاقت، اقتدار اور برتری کے وسیلے کے طور پر بھی دیکھتے ہیں۔ یہی ذہنی ہم آہنگی ان کے تعلق کو مزید پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ وہ محض ہم شکل افراد نہیں رہتے بلکہ ایک دوسرے کی یادوں، خوف، خواہشات اور نفسیاتی کیفیات میں بھی شریک ہونے لگتے ہیں۔ قیدی کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خوجہ نے صرف اس سے علوم نہیں سیکھے بلکہ اس کی زندگی، ماضی اور تجربات کو بھی اس طرح جذب کر لیا جیسے وہ اس کی اپنی یادداشت کا حصہ ہوں۔ قیدی حیرت سے کہتا ہے:

"اسے ہر وہ بات جو میں نے اپنے لڑکپن اور جوانی کی بابت بتائی تھی من و عن یاد تھی، اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک۔"[8]

یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ دونوں کے درمیان محض علمی یا ثقافتی تبادلہ نہیں ہو رہا بلکہ ایک گہرا نفسیاتی اور شناختی عمل جاری ہے۔ خوجہ قیدی کی زندگی کا صرف مطالعہ نہیں کرتا بلکہ اس کی ذات میں داخل ہو کر اسے اپنے تجربے کا حصہ بنا لیتا ہے۔ دوسری طرف قیدی بھی خوجہ کی شخصیت، عادات، ذہنی اضطراب اور خواہشات سے متاثر ہوتا ہے۔ یوں دونوں کی داخلی شناختیں ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگتی ہیں۔ یہ شناختی اختلاط رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے قابل ہو جاتے ہیں:

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

"ہم ابھی تک آئینے کے روبرو نیم برہنہ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ میری جگہ لینے والا تھا، میں اس کی اور انجام دینے کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ اپنے کپڑوں کا تبادلہ کریں، وہ اپنی داڑھی مونڈ ڈالے اور میں اپنی بڑھنے دوں۔"[9]

ناول کے اختتامی حصے میں خوجہ اطالوی قیدی کی شناخت اختیار کر کے وینس چلا جاتا ہے، جب کہ قیدی خوجہ کا روپ دھار کر سلطنتِ عثمانیہ میں درباری نجومی کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگتا ہے۔ اس تبادلے میں صرف دو افراد کے نام، لباس یا ظاہری مقام تبدیل نہیں ہوتے بلکہ مشرق و مغرب کے درمیان قائم روایتی حد بندیاں بھی غیر مستحکم ہو جاتی ہیں۔ خوجہ کا مغرب کی طرف جانا اور قیدی کا مشرقی فضا میں ضم ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے قطعی طور پر جدا نہیں بلکہ ایک دوسرے میں سرایت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس طرح فرد کا شناختی بحران ایک وسیع تر تہذیبی بحران کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پاموک اس داخلی کشمکش کو محض نفسیاتی مسئلہ نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے مشرق اور مغرب کے باہمی تعلق کی تمثیل بنا دیتے ہیں۔ خوجہ کا مغربی علم سے متاثر ہونا، اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور پھر اسی علم کے ذریعے برتری قائم کرنے کی خواہش مشرقی دنیا کی اس اجتماعی نفسیات کو ظاہر کرتی ہے جو ایک طرف اپنی روایت، مذہب اور تہذیبی شناخت سے وابستہ رہنا چاہتی ہے اور دوسری طرف مغرب کی سائنسی ترقی اور علمی طاقت سے مرعوب بھی ہے۔ اگرچہ ترکی کسی باقاعدہ نوآبادیاتی تجربے سے نہیں گزرا، تاہم مغربی جدیدیت کے تہذیبی اور فکری اثرات اس کے اجتماعی شعور میں گہرائی تک موجود رہے ہیں۔ سفید قلعہ اسی اثر پذیری، مرعوبیت، رقابت اور شناختی اضطراب کو علامتی سطح پر پیش کرتا ہے۔

اس تناظر میں خوجہ کی شناختی الجھن صرف ایک فرد کا مسئلہ نہیں رہتی بلکہ مشرقی تہذیب کے اس بحران کی علامت بن جاتی ہے جس میں قدیم اور جدید، مذہبی اور سائنسی، مقامی اور مغربی زاویے بیک وقت متصادم بھی ہیں اور ایک دوسرے میں ضم بھی ہو رہے ہیں۔ خوجہ مغرب سے علم حاصل کرتا ہے، مگر اپنی تہذیبی برتری کا تصور ترک نہیں کرتا۔ قیدی مغرب کی علمی روایت کا نمائندہ ہے، مگر عثمانی ماحول میں رہتے ہوئے رفتہ رفتہ مشرقی تجربے سے متاثر ہوتا ہے۔ یوں دونوں کردار ایک دوسرے کو بدلتے بھی ہیں اور ایک دوسرے کے ذریعے خود کو پہچاننے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سفید قلعہ مشرق اور مغرب کے درمیان قائم روایتی تفریق کو محض بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی فکری بنیادوں کو بھی چیلنج کرتا ہے۔ پاموک مشرق کو ایک غیر فعال، جامد یا صرف مقلد تہذیب کے طور پر پیش نہیں کرتے۔ خوجہ ایک متحرک، ذہین، جستجو پسند اور فکری طور پر سرگرم کردار ہے۔ وہ سائنسی تجربات کرتا ہے، نئی ایجادات کی کوشش کرتا ہے، فلسفیانہ

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

سوالات پر غور کرتا ہے اور اپنی علمی حیثیت منوانے کے لیے مسلسل کوشاں رہتا ہے۔ یہ خصوصیات اس روایتی مستشرقانہ تصور کو رد کرتی ہیں جس میں علم، عقل اور تجربے کو صرف مغرب سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اطالوی قیدی بھی مشرقی ماحول سے غیر متاثر نہیں رہتا۔ وہ ترکی زبان، عثمانی معاشرت، خوجہ کی ذہنی دنیا اور مقامی طاقت کے نظام سے مسلسل اثر قبول کرتا ہے۔ اس کا خوجہ کی جگہ لے لینا اس امر کی علامت ہے کہ مغرب بھی مشرق سے الگ رہ کر اپنی شناخت برقرار نہیں رکھتا بلکہ اس سے متاثر ہوتا ہے، اسے جذب کرتا ہے اور بعض اوقات اسی میں اپنی نئی صورت تلاش کرتا ہے۔ اس لیے ناول میں مشرق اور مغرب کا تعلق یک طرفہ اثر پذیری کا نہیں بلکہ دو طرفہ تبدیلی کا تعلق ہے۔ پاموک اس صورتِ حال کے ذریعے یہ واضح کرتے ہیں کہ مشرق و مغرب کی تقسیم صرف جغرافیائی یا ثقافتی بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ یہ ایک بیانیاتی تشکیل بھی ہے، جسے تاریخ، طاقت، علم اور تہذیبی تصورات مل کر بناتے ہیں۔ شناخت ان کے نزدیک کوئی طے شدہ اور مستقل حقیقت نہیں بلکہ ایک مسلسل تشکیل پانے والا عمل ہے۔ انسان اپنی زبان، یادداشت، ماضی، لباس، تعلقات اور طاقت کے نظاموں کے اندر رہ کر اپنی شناخت بناتا بھی ہے اور بدلتا بھی رہتا ہے۔ خوجہ اور قیدی کا باہمی تبادلہ اسی سیال شناخت کی فنی مثال ہے۔

جالے پارلا (Jale Parla) کے مطابق یہ ناول مشرق کے خلاف قائم کیے گئے مستشرقانہ بیانیے ہی کو نہیں بلکہ مغرب کے بارے میں مشرقی ردِ عمل پر مبنی تصورات کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پارلا کے خیال میں اگر مغربی شعور کے اندر مشرق سے متعلق ایک لاشعوری تصور موجود ہے تو مشرقی شعور بھی مغرب کے بارے میں اپنا ایک داخلی تصور رکھتا ہے۔ اس طرح مشرق محض ایک معصوم یا غیر فعال شے نہیں رہتا بلکہ وہ بھی مغرب کے ساتھ اپنے تعلق کو تشکیل دینے والا فعال شعور رکھتا ہے۔ پارلا اس تناظر میں لکھتی ہیں:

> "If there is a subconscious that structures the Western subject's relationship with the East, then the view that the Easterner is not a passive or innocent object, but also has a subconscious that constructs their relationship with the West, is seen as an anti-orientalist discourse produced in response to orientalist discourses, since it implies an optimism regarding the possibility that the East–West binary based on power relations might one day be disrupted"[10]

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

پارلا کی یہ رائے سفید قلعہ کے مرکزی فکری مسئلے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ناول میں مشرق اور مغرب کو دو بند، یک رخے یا جامد دائرے نہیں بنایا گیا بلکہ انھیں مسلسل بدلتی ہوئی، باہم اثر انداز ہونے والی اور مکالماتی شناختوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یوں سفید قلعہ مشرق اور مغرب میں سے کسی ایک کو حتمی، مکمل یا برتر قرار نہیں دیتا۔ پاموک دونوں تہذیبوں کو ایسے متحرک فکری نظاموں کے طور پر پیش کرتے ہیں جو وقت، تاریخ، علم، طاقت اور باہمی تعلق کے نتیجے میں بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مشرق اور مغرب کے درمیان فرق ضرور موجود ہے، مگر یہ فرق ناقابلِ عبور دیوار نہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں، ایک دوسرے سے خوف زدہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں، ایک دوسرے کو بدلتے ہیں اور اسی عمل میں اپنی شناخت از سرِ نو تشکیل دیتے ہیں۔ خوجہ اور اطالوی قیدی کا تعلق اسی امکان کو سامنے لاتا ہے کہ تہذیبی دوئی ہمیشہ مستقل نہیں رہتی؛ طاقت کے رشتے بدل سکتے ہیں، شناختیں ایک تہذیب سے نکل کر دوسری تہذیب میں داخل ہو سکتی ہیں، اور انسان اپنی ذات کو کسی ایک قطعی تہذیبی مرکز تک محدود نہیں رکھ سکتا۔

پاموک خود بھی اسی فکری موقف کی تائید کرتے ہیں۔ ایک انٹرویو میں جب ان سے ترکی میں مشرقی اور مغربی رجحانات کی تقسیم کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

> "میں پُر امید ہوں۔ ترکی کو دو روحیں، جو کہ مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی موجودگی پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ آپ حقیقت سے اپنا تعلق کھو سکتے ہیں۔ میں ایک فکشن نگار ہوں، اس لیے میں اسے بڑی شے خیال نہیں کرتا، لیکن آپ کو اپنے شیزوفرینیا سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آپ اس سے بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں کہ ایک حصہ دوسرے کو مار رہا ہے تو آپ کے پاس صرف ایک روح رہ جائے گی۔ یہ بیماری سے زیادہ برا ہے۔ یہ میرا نظریہ ہے، اور میں اسے ترکی کی سیاست میں پھیلانے کی کوشش کرتا ہوں، ان سیاست دانوں کے درمیان جو مطالبہ کرتے ہیں کہ ترکی کی ایک مستقل روح ہونی چاہیے، چاہے وہ مشرقی ہو، مغربی ہو یا قومی ہو۔ میں اس یک طرفہ نقطۂ نظر کا نقاد ہوں۔"[11]

یہ اقتباس پاموک کے تہذیبی نقطۂ نظر کو نہایت وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ ترکی کی تہذیبی دوئی کو کمزوری یا بیماری نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ایک ایسی تخلیقی صورتِ حال کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں مختلف شناختیں ایک ساتھ موجود رہ سکتی ہیں۔ پاموک کے نزدیک مسئلہ یہ نہیں کہ ترکی کے اندر مشرقی، مغربی یا قومی رجحانات بیک وقت کیوں پائے جاتے ہیں؛ اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

جب ریاست، سیاست یا نظریاتی سخت گیری ان میں سے کسی ایک کو ترکی کی واحد اور حتمی روح قرار دینے لگتی ہے۔ اس لیے وہ ایک ایسی مستقل روح کے تصور کو رد کرتے ہیں جو قوم کو کسی ایک تہذیبی شناخت میں بند کر دے۔ اسی انٹرویو میں پاموک مغرب کی غلامانہ تقلید اور عثمانی ماضی کی بے جان نقل، دونوں کو مسئلے کا حل نہیں سمجھتے۔ ان کے الفاظ میں:

"غلامانہ طریقے سے مغرب کی نقل یا اندھے پن کے ساتھ مردہ عثمانی ثقافت کی نقل، معاملے کا حل نہیں ہے۔"[12]

یہ بیان پاموک کے فکری توازن کو مزید واضح کرتا ہے۔ وہ نہ مغرب کی اندھی تقلید کے حامی ہیں اور نہ عثمانی ماضی کی جامد باز آفرینی کے۔ ان کے نزدیک تہذیبی شناخت نہ محض مغرب سے مستعار لی جا سکتی ہے اور نہ ماضی کی مردہ صورتوں کو دہرا کر زندہ رکھی جا سکتی ہے۔ اصل امکان اس تخلیقی مکالمے میں ہے جس کے ذریعے کوئی معاشرہ اپنی تاریخی یادداشت کو محفوظ رکھتے ہوئے جدید علمی، فکری اور تہذیبی تجربات سے بھی اثر قبول کرے۔

اسی تناظر میں سفید قلعہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاموک مشرق اور مغرب میں سے کسی ایک کو حتمی، مکمل یا برتر قرار نہیں دیتے۔ وہ دونوں تہذیبی رویوں کو متحرک فکری نظاموں کے طور پر پیش کرتے ہیں جو وقت، تاریخ، علم، طاقت اور باہمی تعلق کے نتیجے میں بدلتے رہتے ہیں۔ خوجہ اور اطالوی قیدی کا باہمی تبادلہ اسی حقیقت کی علامت ہے کہ تہذیبی شناخت تنہائی میں نہیں بنتی بلکہ تعلق، تصادم، مکالمے، اثر پذیری اور خود احتسابی کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ اس اعتبار سے سفید قلعہ مشرق و مغرب کی سادہ کشمکش کا ناول نہیں بلکہ تہذیبی شناخت کی پیچیدہ تشکیل، علم اور طاقت کے باہمی رشتے، نفسیاتی برتری کی خواہش اور تہذیبوں کے باہمی نفوذ کا گہرا فکری مطالعہ ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اورحان پاموک کا ناول سفید قلعہ مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش کو کسی سادہ، سطحی یا یک رُخے انداز میں پیش نہیں کرتا۔ ناول کا بنیادی بیانیہ ایک اطالوی قیدی اور ترک عالم خوجہ کے تعلق کے گرد گھومتا ہے، مگر یہ تعلق دو تہذیبی نظاموں کی علامت بن جاتا ہے۔ ان کے درمیان علم، زبان، یادداشت، لباس، ماضی اور سماجی حیثیت کا تبادلہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ شناخت کوئی مستقل، بند یا فطری حقیقت نہیں بلکہ ایک مسلسل تشکیل پانے والا عمل ہے۔ خوجہ کا قیدی کی شناخت اختیار کر کے مغرب کی طرف جانا اور قیدی کا خوجہ بن کر عثمانی سلطنت میں رہ جانا اس امر کی علامت ہے کہ مشرق اور مغرب کی حد بندیاں اتنی قطعی نہیں جتنی بظاہر تصور کی جاتی ہیں۔ یہاں مغرب ہمیشہ فعال اور مشرق ہمیشہ غیر فعال نہیں رہتا بلکہ دونوں ایک دوسرے سے اثر قبول کرتے ہیں اور دونوں کے اندر اپنی اپنی نوعیت کا اضطراب موجود ہے۔

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

پاموک کسی ایک تہذیب کے ترجمان نہیں بنتے۔ وہ نہ مغرب کی غلامانہ نقل کو مسئلے کا حل سمجھتے ہیں اور نہ مردہ عثمانی ثقافت کی اندھی تقلید کو۔ ان کے نزدیک اصل امکان اس تخلیقی مکالمے میں ہے جس کے ذریعے کوئی معاشرہ اپنی تاریخی یادداشت کو محفوظ رکھتے ہوئے نئے علمی، فکری اور تہذیبی تجربات سے بھی اثر قبول کرے۔ اس اعتبار سے پاموک مشرق و مغرب کے تعلق کو محض رد و قدح، خوف یا تہذیبی برتری کی بنیاد پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے ایک ایسے فکری و تخلیقی عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں شناختیں باہم ٹکراتی بھی ہیں، بدلتی بھی ہیں اور نئی صورتیں بھی اختیار کرتی ہیں۔

"مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں، خدا ہمیں خالص اور بے آمیزش کی آرزو سے محفوظ رکھے۔"[13]

سرخ میرا نام میں ایک کردار کی زبان سے کہا گیا یہ جملہ پاموک کے تہذیبی تصور کی گہرائی کو واضح کرتا ہے۔ اس میں ایک طرف اس قرآنی تصور کی بازگشت محسوس ہوتی ہے جو مشرق و مغرب کو کسی ایک قوم، سلطنت یا تہذیب کی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی وسیع کائنات کا حصہ قرار دیتا ہے، اور دوسری طرف یہ خیال بھی سامنے آتا ہے کہ تہذیبیں خالص، بند اور غیر متغیر نہیں ہوتیں۔ وہ مختلف تاریخی تجربات، ثقافتی اثرات اور فکری تعاملات سے گزرتی ہیں۔ پاموک کے نزدیک مشرق اور مغرب کے درمیان فرق ضرور موجود ہے، مگر یہ فرق ناقابلِ عبور دریا نہیں بلکہ ایک ایسا متحرک فاصلہ ہے جہاں تصادم کے ساتھ ساتھ فہم، رواداری، اثر پذیری اور تخلیقی اشتراک کے امکانات بھی موجود رہتے ہیں۔ یہی سفید قلعہ کا حاصلِ مطالعہ اور اورحان پاموک کے نقطۂ نظر کی بنیادی جہت ہے۔

Gohar-e-Tahqeeq
HEC "Y" Category
ISSN E: 2957-9155/ ISSN P: 2958-0935
Vol. 05, Issue. 01, June 2026
Page. 45-57

حوالہ جات

1. Shuaib Mohammad Bhat, *Orhan Pamuk's Select Novels: A Study in Realism* (PhD diss., Jiwaji University, Gwalior, 2018), 45.

2 . Orhan Pamuk, *Istanbul: Memories and the City*, trans. Maureen Freely (New York: Vintage International, 2006),127.

3. The Nobel Prize, "The Nobel Prize in Literature 2006," October 12, 2006, https://www.nobelprize.org/prizes/literature/2006/summary/

4۔ اورحان پاموک، سفید قلعہ، مترجم: عمر میمن (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، 2004ء)، 35۔

5۔ پاموک، سفید قلعہ، 36۔

6۔ پاموک، سفید قلعہ، 80۔

7۔ پاموک، سفید قلعہ، 31۔

8۔ پاموک، سفید قلعہ، 97–98۔

9۔ پاموک، سفید قلعہ، 116۔

10. Jale Parla, "Roman ve Kimlik: Beyaz Kale," in *Orhan Pamuk'u Anlamak*, ed. Engin Kılıç (İstanbul: İletişim Yayınları, 2006), 3.

11۔ اینجل گر آ فنتانا، ''اورحان پاموک انٹرویو''، مشمولہ، کراچی ریویو، کتابی سلسلہ نمبر 01، مترجم: شیخ نوید (کراچی: سٹی بک پریس، فروری 2019)، 24۔

12۔ پاموک، انٹرویو 25۔

13۔ اورحان پاموک، سرخ میرا نام، مترجمہ: ہما انور (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، 2021)، 34۔